ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں میں جنسی، نفسیاتی اور اور معاشرتی بیانیہ

Sexual, psychological and social narrative in Dr. Saleem Akhtar's fiction

ثمیرہ کوثر

سینئر ہیڈ مسٹریس، گورنمنٹ مسلم گرلز ہائی سکول، رام تلائی، پنجاب

یاسر ذی شان مغل

لیکچرر شعبہ اردو، گورنمنٹ جناح اسلامیہ گریجوایٹ کالج، سیال کوٹ

ڈاکٹر ابرار خٹک

اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، نوشہرہ، کے پی کے

ABSTRACT : Dr. Saleem Akhtar's ancestral village is Sialkot but he was born in Lahore and spent his childhood in different big cities, thus he got a chance to see the cultural life of many cities. He kept a close eye on the sexual, psychological and social issues in this civilized life and these sexual, physical and social aspects were preserved in his subconscious which eventually one day traveled back in the form of words and in his fictions it Everything began to be reflected, all these things hidden in his subconscious are clearly visible in his fiction, he has made sexual stuffiness and social problems the heartbreak of every human being. The beauty of his fiction is that on the one hand it is the color of cultural psychology and on the other hand the effects of sex which are also the expression of hidden elements in the subconscious and the reflection of society. It is described in the form of hidden human attitudes. In this article, according to these initiatives, the narrative of sexual, psychological and social problems in his fiction has been reviewed.

Keywords: Fiction, Sexual Fiction , Social Fiction, Saleem Akhtar, Unconscious aspects in fiction

کلیدی الفاظ: افسانہ، جنسی افسانہ، معاشرتی افسانہ، سلیم اختر، افسانے میں لاشعوری تحریکات

تمہید: ڈاکٹر سلیم اختر کا قریہ اجداد سیالکوٹ ہے لیکن ان کی پیدایش لاہور میں ہوئی اور بچپن مختلف بڑے شہروں میں گزار، یوں انھیں بہت سے شہروں کی تہذیبی زندگی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس تہذیبی زندگی میں موجود جنسی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل پر ان کی گہری نگاہ رہی اور یہ جنسی، نفسیاتی اور معاشرتی پہلو ان کے لاشعور میں محفوظ ہوتے گئے جنھوں نے بالآخر ایک دن لفظوں کی صورت واپسی کا سفر کیا اور ان کے افسانوں میں یہ سب جھلکنے لگا، ان کے افسانوں میں ان کے لاشعور میں پوشیدہ یہ سب باتیں واضح نظر آتی ہیں، جنسی گھٹن اور معاشرتی مسائل کو انھوں نے ہر انسان کی قلبی واردات بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو تہذیبی نفسیات کا رنگ ہے اور دوسری طرف جنس کے اثرات جو لاشعور میں پوشیدہ عناصر کا اظہار بھی ہیں اور معاشرے کا عکس بھی یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے میں نفسیاتی الجھنوں کو شعوری اور لاشعوری طور پر چھُپے ہوئے انسانی رویوں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں انھی پہلوں کے مطابق ان کے افسانوں میں موجود جنسی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کے بیانیہ کا جائزہ لیا گیا ہے

اردو کے نامور نقاد، افسانہ نگار، ماہرِ لسانیات، ماہرِ اقبالیات، ادبی مؤرخ، معلم اور محقق سلیم اختر لاہور میں ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔(1) سلیم اختر کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ڈاکٹر سلیم اختر کے والد قاضی عبدالحمید ملٹری اکاؤنٹس (CMA) میں ملازمت کی وجہ سے شہر شہر جاتے رہے، جہاں جاتے بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔ یوں داکتر سلیم اختر نے بچپن سے ہی انبالہ، پونی، لاہور اور راول پنڈی جیسے بڑے شہروں کی معاشرتی زندگی کا ذائقہ چکھا۔ تعلیم کا سفر بھی ان ھی شہروں میں رہا۔ 1951 میں میٹرک فیض الاسلام ہائی اسکول راولپنڈی سے، ایف اے اور بی اے گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی سے اور ڈپلومہ آف لائبریری سائنس، ایم اے اردو اور پی ایچ ڈی کی تکمیل برصغیر کے شہر آفاق علمی ادارے پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے کی۔ اور معش کے لیے بھی تعلیم کے میدان کو ہی چنا۔ بطور اردو لیکچرار گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان سے آغاز کیا پھر 8 سال بعد گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے اور 1994ء میں یہاں تکمیل ملازمت کی لیکن علمی ماہر ہونے کی وجہ سے مزید 11 سال اس ادارے میں بطور وزیٹنگ پروفیسر پڑھایا۔ قیام لاہور میں ہی یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مختلف ادبی رسالوں کے ساتھ بھی منسلک رہے اور تعلیمی دنیا کے ساتھ ادبی دنیا میں ادبی تحقیق کار، افسانہ نگار اور نقاد بلکہ نفسیاتی نقاد کے اپنی پہچان بنائی۔ بطور محقق ان کی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ نے حوالے کی کتابوں میں جگہ بنائی۔ ان کی تحلیقات میں رومان اور جذبات کے ساتھ ساتھ ترقی پسند خیالات کی بھی یلغار ہے۔

آغاز میں سلیم اختر نے مختصر تنقیدی مضامین تحریر کیے۔ یہ مضامین کوہستان (راولپنڈی)، تعمیر (راولپنڈی)، ہفت روزہ "قندیل" لاہور، "تعلیم و تربیت" و دیگر رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ ادبی تنقیدی مضامین تحریر کرنے کے رُجحان کے ساتھ دیگر موضوعات پر بھی مضامین تحریر کرنے شروع کئے چنانچہ ہفت روزہ "ادارہ" لاہور میں قلمی موسیقی (۱۳، اکتوبر ۱۹۵۱ء) شیر میسور، نیرنگ خیال (روالپنڈی) ستمبر ۱۹۴۹ء (ان کے پہلے مضمون "غزل میں تصوّرِ محبوب (مطبوعہ نیرنگ خیال، جنوری ۱۹۵۴ء) میں مستقبل کے نفسیاتی نقاد کی بنیادیں پڑھنے کو ملتی ہیں، اس کے علاوہ مضمون میں فلسفہ، تصوّف اور مصوّری کے بارے میں اہم معلومات بھی ملتی ہیں۔ سلیم اختر کے تین اور مقالات ابن الوقت، اکبر کی شاعری اور اکبر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہمایوں لاہور (ایڈیٹر: ناصر کاظمی) میں شائع ہوئے۔ ان مقالات میں بقول ڈاکٹر طاہر تونسوی: تنقیدی اُپج موجود تھی۔ ان کے ان مقالات اور دیگر ابتدائی تحریروں کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خیال ہے کہ

> "سلیم اختر کے لکھنے پڑھنے کی عمر ایسی زیادہ نہ سہی لیکن کتابوں سے دلچسپی کی حد تک وہ اپنے بعض ہمعصروں سے عمر میں زیادہ ہے۔ ان کی تحریروں کی پختگی ان کے اسلوب کی سنجیدگی، ان کے موضوع کی رنگارنگی اور ان کی رائے کی اصابت سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، تسلّی بخش مطالعہ اور غور و فکر کے بعد لکھا ہے... ان کی

ابتدائی تحریروں میں وہ بھی کچا پن نظر نہیں آتا جو نووارد وں کے یہاں عموماً پایا جاتا ہے۔ جھلاّہٹ، ادھ کچرے خیالات، خود نمائی، اظہارِ علم طعن و تعریض اور خود ستائی ان کے یہاں کہیں نہیں ہے۔ الفاظ کی شعبدہ گری اور خیالات کا ہیر پھیر ان کے یہاں نظر نہیں آتا۔ جملے بازی کا فن بھی ان کے یہاں نہیں ہے۔ بات کا بتنگڑ بنانے یا قاری کو خواہ مخواہ چونکانے کی کوشش بھی ان کے یہاں نہیں ملتی۔ دوسروں کی کہی ہوئی بات کو اپنے الفاظ میں خوبصورتی سے دہرانے یا غیر ضروری حوالوں کے ذریعے قاری پر رعب جمانے کے ڈھب سے بھی وہ ناواقف ہیں۔ مختصر یہ کہ الفاظ و خیالات دونوں کے اینچ پینچ سے ان کی تحریریں عمداً پاک ہیں۔ شعر و ادب کے باب میں ان کی سوچ ایک سیدھی سادھی معصوم سوچ ہے اس سوچ میں چونکہ گہرائی بھی ہے۔ وسعت بھی اور اس کا اظہار حد درجہ سادگی و معصومیت کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے ادب کے قاری پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ تحریر کی یہ خصوصیت و انفرادیت سلیم اختر کے ہر مضمون اور ہر کتاب میں نظر آتی ہے۔"(2)

ڈاکٹر سلیم اختر کی تخلیقات کا دائرہ محض ایک صنف ادب سے محدود نہیں وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار اور نقاد ہیں۔ مگر ان کی تخلیقات کا دائرہ محض افسانہ اور تنقید تک محدود نہیں بطور تخلیق کار انہوں نے تنقید، نفسیات، اقبالیات، تاریخ زبان وادب نہ مذہب، طنز و مزاح، سفر نامہ، آپ بیتی اور افسانہ کے میدان میں 92 تخلیقات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی کتب میں تنقید کی بنیاد نفسیات ہے وہ شاعروں کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں اور شاعری میں نفسیاتی بنیادیں تلاش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا محبوب موضوع نفسیات ہے۔ افسانہ نگاری اور تنقید کے میدان میں قدم رکھنے سے قبل انہوں نے نفسیات خصوصاً جنسی نفسیات پر لکھا۔

اقبالیات کے شعبہ میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کتب دو قسم کی ہیں۔ ایک ان کی تخلیقات کے دوسری تالیفات اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، ان تخلیقات اور تالیفات ہیں۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، فکر اقبال کے مشہور گوشے اقبال کا ادبی نصب العین، اقبال کے نقوش، اقبال شعاع صد رنگ، اقبال ممدوح عالم، فکر اقبال کا تعارف و ترجمہ) اقبال اور ہمارے فکری رویے۔ اقبال شناسی کے زاویے اقبال کی فکری میراث علامہ اقبال حیات فکر و فن۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا اقبالیات پر کام میں سلیم اختر بحیثیت نفسیاتی نقاد سامنے آتے ہیں جنہوں نے اقبال کی شخصیت کو ہوا بنا کر اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا اور یہ کام سلیم اختر کی شعوری کوشش ہے۔ تاریخ زبان اردو اور ادب میں بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے رام بابو سکینہ سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک لوگوں نے بعض ادیب شماری کو تاریخ ادب سمجھ لیا ہے ڈاکٹر سلیم اختر نے اس افراتفری کے دور میں کم وقت زیادہ پڑھنے کے لیے تاریخ ادب اردو کو کیپسول بنا کر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ لکھی گو اس نے لاتعداد ایڈیشن چھپنے کے بعد اب یہ ہزار صفحات سے تجاویز کر گئی اسی طرح اردو زبان کے آغاز، ارتقاء، نشوونما تحریکات / رسم الخط، لغت نویسی اور اردو لسانیات پر مدلل معلومات کا ذخیرہ "اردو زبان کیا ہے" میں جمع کر دیا ہے۔

جدید اردو ادب میں ادب اور نفسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور آج کل جدید علوم کی آگہی سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے اس ضمن میں دیوانند اسر لکھتے ہیں:

"ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے کو واضح کرنے کے لیے گوناگوں نظریات کے مطالعے اور تجزیے کی ضرورت آج کئی گنا بڑھ گئی ہے ادبی مسائل پر بحث کے دوران میں سماجی، سیاسی، معاشی، سائنسی، فلفسیانہ، مذہبی اور اخلاقی نکات اٹھائے جاتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب بھی ادیب کی شخصیت اور اس کے تخلیقی عمل پر بحث ہو گی نفسیات کا ذکر ناگزیر ہو گا۔ انسان کا ہر شعوری عمل بنیادی طور پر اس کے ذہن سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اُس کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لیے اُس کی ذہنی ساخت اور اس کے ذہنی عمل کا مطالعہ ضروری ہے علم نفسیات کے ذریعے ہم ادیب کا مطالعہ اس کی انفرادی اور مثالی Type حیثیت سے کرنے کے بعد اس کے تخلیقی عمل کے سرچشمے کا راز پاسکتے ہیں۔"(3)

اردو ادب میں یہ وہ زمانہ ہے جب ادب کے پس پردہ تخلقی عوامل کا جائزہ لیا جانا بھی ادب کا حصہ بنتا گیا اور نفسیاتی تنقید نے اہمیت اختیار کر لی جس کے اثرات دیگر اصناف ادب کے ساتھ ساتھ افانسے پر بھی پڑنے لگے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد واضح طور پر اردو افسانہ پر اور نفسیاتی عناصر کے باہمی ربط پر روشنی ڈالتے ہیں

"مجموعی طور پر دیکھا جائے۔۔۔تو ان دہائیوں میں جدید علوم و نظریات کی طرف پیش قدمی ملتی ہے۔ نوفرائیڈین نفسیات، وجودیت اور طبیعیات ومابعد الطبیعیات کا سائنسی انداز فکر اردو افسانے میں نمایاں ہوتا ہے۔ تہہ داری اور رمزیت کے لیے افسانہ نگاروں نے شعور کی رو، داخلی خود کلامی، آزاد تلازمہ خیال کو تکنیکی حربوں کے طور پر استعمال کیا۔ مغرب کی جدید تحریکوں سوریئلزم، ڈاڈاازم اور سٹرکچرل ازم کو معیار بنا کر افسانے کی ساخت کو نیا رنگ روپ دیا گیا۔ کرداروں کی بجائے پرچھائیں کو اہمیت دینا، وقوعے پر خیال کو حاوی رکھنا، مکمل لفظوں اور جملوں کی بجائے دائروں، لکیروں، قوسوں اور نقطوں کو نمایاں کرنا۔ لفظوں کو توڑنا پھوڑنا، فقروں کو ادلنا بدلنا، شاعرانہ تلازمے بنانا، پیکر تراشی کرنا اور تشبیہات واستعارات کو بہ تکرار استعمال کرنا اہمیت اختیار کر گیا۔"(4)

اردو ادب میں یہ عمل شروع ہوا تو ادب میں نفسیات کے مختلف دبستانوں کے بانیوں ژالے، فرائیڈ ژونگ اور ایڈلر کے نظریات کے اردو ادب پر اثرات نظر آنے لگے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ادیب اپنے ادب کی بنیاد نظریات پر نہیں افراد پر رکھتا ہے۔ تینوں ماہر نفسیات ژالے، فرائیڈ ژونگ اور ایڈلر کی بنیاد انسانی ذہن کے لاشعوری عمل پر ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے تمام نفسی امراض اور کجرویوں کی اساس کشمکش ہے۔ اور ادب اس خفتہ خواہشات اور عقلی رشتوں کا فطری اور سماجی ذریعہ اظہار ہے۔ بقول دیواندراسر:

"یہ کشمکش ادیب کے لاشعور سے جنم لیتی ہے۔ اور اس کا محرک وہ شے نہیں جسے ہم بادی النظر میں دیکھ لیتے ہیں بلکہ جو اس کے لاشعور میں جاگزین ہوتی ہے اس کشمکش کو سمجھنے کے لیے محض اس کے لاشعور محرک کو الگ طور پر بیان کر دینا کافی نہیں۔ بلکہ شخصیت کو مجموعی حیثیت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ محرکات کی کشمکش ایک گنجلک

صورت Complex Pattern میں ظاہر ہوتی ہے جس میں شخصیت کے مختلف پہلو باہم
دست و گریباں ہوتے ہیں"۔(5)

ژالے کے مطابق نارمل Normal شخصیت کا اظہار نفس تناؤ Psycho Tension اور امتزاج کا استبداد Capacity for symthes is پر ہے ژالے اپنے فلسفے کی بنیاد ذات Self یا) Ego انا) پر رکھتا ہے لیکن فرائیڈ شخصیت کے اجزاء جنسی خواہش اور اس خواہش کا والدین پر مرکوز ہونا ہے فرائڈ صرف جنسی قوت Libido پر زور دیتا ہے۔ ژونگ کے مطابق انسان کی بنیادی جبلت جنسی Libido نہیں بلکہ ہمہ گیر نفسی قوت ہے جسے حصول قوت کی خواہش قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایڈلر نے فرائڈ کے نظریہ سے انحراف کر کے انفرادی نقطہ نظر پیش کیا کہ انسان اپنی ذہنی یا جسمانی کمتری کو (جو وہ حقیقی خیال کرتا ہے) دور کرنے کے لیے تلافی (Compensation) کے طریقہ پر عمل کرتا ہے۔

نفسیات کے ماہرین کی شب و روز کی محنت اور تجزیہ اور تحقیق کی بدولت ادب میں ایک انقلاب کا آغاز ہوا۔ فرائڈ۔ ایڈلر۔ میک ڈوگل۔ یونگ اور ان کے بعد ماہرین نفسیات مثلاً اوٹو رینک otto Rank ڈیزمنڈ میکارتھی Desmind Maccarlhy ۔ولسن نائٹ (Wilson Knight) نے ادب میں نفسیات کے اہم جزو تحلیل نفسی کا ذکر کیا اس سے ادب کی مختلف اصناف شعر، افسانہ، ناول، ڈرامہ اور تنقید میں نئی روایت کی داغ بیل پڑی۔ یہاں تک کہ اردو ادب میں تحلیل نفسی کی روایت کی ابتداء ۱۹۳۰ء سے ہوئی۔ میراجی، ریاض احمد نے شاعری میں نفسیاتی اساس تلاش کرنے کی کوشش کی تو افسانہ میں سعادت حسن منٹو۔ ممتاز مفتی، شیر محمد اختر، احمد الطاف، الطاف فاطمہ، عزیز احمد، قراۃ العین حیدر اور ممتاز شریں نے نفسیات کی اور تجزیاتی مطالعات کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ ماہرین نفسیات نے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں کو جنسی جذبہ سے جوڑنے کی کوشش کی انہوں نے فرائڈ کے ابتدائی خیالات کی بنیاد پر یہ نظریہ پیش کیا۔ جس کے مطابق مذہب، آرٹ، کلچر، سیاست اور سائنسی ایجادات سب کی سب جنس کی ارتقائی صورت ہیں۔ فرائڈ کے قائم کردہ نظامِ فکر میں سارے انسانی جذبات کی تقدیس جنس کے دیوپیکر بُت کی نذر کر دی گئی ہے یہاں تک کہ ماں بیٹے کی محبت اور باپ بیٹی کا پیار بھی جنسی عشق ٹھہرایا گیا ہے اور تمام تر ذہنی پیچیدگیوں کی بنیاد کو جنسی گھٹن Sex repression کی بنیاد کہا گیا۔ فرائڈ کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات میکڈوگل نے ایک نیا نظریہ پیش کیا کہ انسانی فطرت چند حیوانی جبلتوں کے عمل اور اس کے ردّ عمل سے عبارت ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ جنسی میلان کے جسمانی مظاہر کو روکا جائے تو اس رکاوٹ کو ہم بہتر مصرف میں لا سکتے ہیں۔ اس انتہا پسند نظریے کے مطابق جاندار۔ انسان ہو یا جانور وہ ہمیشہ اپنی حیوانی اور جنسی جبلت کا غلام رہتا ہے یہ دراصل انسان اور حیوان کی جبلتوں کو ایک مقام پر لا کر انسانیت کی تذلیل کے برابر ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسی انسانی نفسیات کو سمجھا اور پرکھا ہے اور انسانی نفسیات کے عقدوں کو اپنی ادبی حیثیت اور فن فکر سے کھولنے کی سعی کی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر سلیم اختر کے اردو افسانے پر جدید نفسیات کا یہ نیا اور نمایاں اثر سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی رائے ہے کہ:

> "نفسیات نے اردو تنقید پر بھی اثر ڈالا۔ اگر سلیم اختر کو نفسیاتی تنقید کا نقشِ اولین قرار دیا جاتا ہے مگر سلیم اختر میراجی کو نفسیاتی تنقید کا اوّلین نقش قرار دیتے ہیں۔ میراجی کے بعد آفتاب احمد حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، ریاض احمد، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر محمد حسین، شبیہہ الحسن اور ابن فرید نے نفسیاتی تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس فہرست میں ڈاکٹر سلیم اختر اس گروہ کے رہنما دکھائی دیتے ہیں۔"(6)

ادب اور نفسیات کے اس باہمی رشتے کے متعلق خود ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے:

> ''نفسیات کو برتنے سے پہلے اتنا مطالعہ ہونا ضروری ہے کہ اس کی حدود کا صحیح ادراک ہو سکے۔ یہ اس لیے تا کہ نفسیاتی نقاد کو یہ علم ہو کہ کن امور میں نفسیات سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اور کہاں یہ ممکن نہیں۔ میں اپنے نفسیاتی مطالعے کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے نفسیاتی مطالعے کی حدود کو ملحوظ رکھ کر بات کی''(7)

اسی بات کو ایک دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں کہ

> ''پہلی بات تو یہ کہ میرے افسانے جنسی نہیں بلکہ نفسیاتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان افسانوں کا بنیادی استعارہ جنس بنتی ہے لیکن اصل مسئلہ نفسیاتی ہوتا ہے۔ یعنی نفسیاتی الجھن یا Complex کو موضوع بنایا گیا تھا۔ گذشتہ پانچ چھ سال سے میں نے اپنا انداز تبدیل کر لیا اس کا بڑا محرک تو روحِ عصر ہے، پھر اپنے لیے نئی تکنیک اور نئے اسلوب سے وابستہ تخلیقی امکانات دریافت کرنے کی یہ ایک کوشش بھی ہے۔''(8)

اگرچہ ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے معاشرتی، تجدیدی، علامتی، اساطیری بھی ہیں مگر ان کے زیادہ تر افسانے نفسیاتی ہیں چونکہ وہ نفسیات داں بھی ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں سگمنڈ فرائڈ کا فلسفہ جنس، شعور، تحت الشعور اور لاشعور، تحلیلِ نفسی، کارل گستاؤ کے نظریہ خواب ہائے بیداری، اجتماعی لاشعور اور الفریڈ ایڈلر کا نظریہ احساس کمتری اور اجتماعی اعصابی خلل نمایاں ہیں۔ اگرچہ منٹو نے جنس نگاری میں بھی کمال حاصل کیا۔ مگر منٹو کے برعکس ڈاکٹر سلیم اختر جنس کو فرد کا مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ جنس کے پس پشت محرکات و عوامل تک رسائی چاہتے ہیں۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر سلیم اختر نے جنس سے وابستہ نفسیاتی مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے ان نفسیاتی مسائل میں ہم نسائی جنسیت (Lesbanism)مردانہ ہم جنسیت (Homosexualism)اذیت پسندی (Sadism)جنسیت (Frnslnation)رجعت پسندی (Regression)احساس کمتری (Inferiority) تحفظ کا احساس نرگسیت، پاپرستی (Foot Fetishism) اعصابی تناؤ (Depression)جذبہ رقابت (Jealousy) اشتعال (Violence) شامل ہیں ان نفسیاتی مسائل کو پس منظر میں دیکھتے ہوئے معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ان میں ہر طرح کے مرد و عورت ہر مذہب عقیدے سے تعلق رکھنے والے نوجوان، جوان عمر رسیدہ افراد شامل ہیں۔ ان میں معاشرے میں شادی شدہ مرد و زن، کنوارے افراد جنس پرست افراد، نفسیاتی الجھنوں کا شکار، انتقام پر تیار افراد دراصل یہ معاشرے میں موجود افراد کا نگار خانہ ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے سکولوں کے ہاسٹلوں اور نرسز ہاسٹلز میں مقیم جنس زدہ افراد کی تصویر کشی کی ہے اس ضمن میں ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں۔

> ..... ''ہم جنسیت پر میرے افسانوں میں اُن ماسٹروں کا ذکر ہے جن کے اس حوالے سے سکینڈلز بنے اور لزبن کے حوالے سے ہاسٹلوں میں رہنے والیاں نرسیں اور استانیاں اور وہ پیشے جہاں بہت ساری کنواری لڑکیوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ ان میں یہ بیماری اس قدر ہے کہ ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔۔۔ صرف کنواری عورتوں میں نہیں ایک رُخ پر آکر شادی شدہ عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔۔۔''(9)

ڈاکٹر سلیم اختر نے ہم جنسیت عورتوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ان کی اعصابی کیفیت اور جنسی گھٹن کا ردّ عمل قرار دیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

> ....."ہم جنس پرست عورتوں کی اکثریت بے حد کٹر اور رجعت پسند ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے ماحول میں مرد کا سایہ ہما سے کم نہیں ہوتا۔ ان حالات میں عورتوں کا جنسی تسکین کے لیے اپنی ہم جنس کی طرف رجوع کر لینا کوئی بعید از قیاس نہیں۔ یا پھر وہ عورتیں جو شدید احساس کمتری کے ہاتھوں خود پر اعتماد ہی کھو بیٹھی ہوں اور انھیں یہ یقین ہو کہ اب جنسی لحاظ سے کسی مرد کو اپنی طرف ملتفت نہ کر سکیں گی۔ ایسی عورتیں بھی ان ہی خطوط پر جنسی تسکین کا سامان بہم پہنچا لیتی ہیں۔"(10)

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ نسائی ہم جنسیت کا شکار عورت مردوں سے نفرت کا شکار ہو کر ردّ عمل کے طور پر جنسی تسکین کی راہیں تلاش کرتی ہے:

> "۔۔۔وہ مردوں سے متنفّر سی ہو کر اپنی ہی جنس میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے نزدیک مردوں کی ذات ظالم، جابر اور وحشی ہے کیوں کہ انھوں نے عورتوں کو ہر لحاظ سے اپنا تابع اور غلام بنا رکھا ہے۔ یہی احساس اپنی انتہائی صورتوں میں عورت کو خود لذتیت، ہم جنس پرستی اور دیگر کج رو رجحانات سے روشناس کرانے کا باعث بنتا ہے۔۔ ایسی عورتوں کی اکثریت جنسی لحاظ سے کبھی بھی کسی مرد سے مطمئن نہیں ہو سکتی کیوں کہ جنسی فعل سے مکمل آسودگی حاصل کرنے کے نری جسمانی مفعولیت ہی ضروری نہیں بلکہ ذہنی مفعولیت بھی لازمی ہوتی ہے اور وہی ان کے بس کا روگ نہیں ہوتی۔۔۔ یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو عورت ایک مرد کی گرم جوشی کا جواب اسی انداز میں نہیں دے سکتی وہ اپنے جسم کی تمام لطافتیں اپنی ہم جنس کے حضور پیش کر دیتی ہے۔"(11)

ڈاکٹر سلیم اختر کے ان جنسی نفسیاتی افسانوں میں سلیم اختر کا نظریہ واضح نظر آتا ہے۔ ان افسانوں کے پسِ منظر کا مشاہدہ اور مطالعہ قاری کو نفسیات کی بھول بھلیوں اور پیچیدگیوں میں نہیں الجھایا اور کرداروں کے موضوعات کا تجزیہ سادہ زبان میں کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا سب سے معیاری اور شاہکار افسانہ مس احمد بی اے۔ بی ٹی اس افسانے کا مرکزی کردار مس احمد نفسیاتی کش مکش اور جنسی بحران کا شکار ہے۔ اس کا وقت پر شادی نہ ہونا اس کے لیے نفسیاتی مسائل پیدا کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار رشیدہ احمد جو مس احمد بن چکی ہے یہ خاتون مظلوم ماں اور شرابی باپ کی بیٹی ہے اس کے پاس لڑکیوں سے محبت کا جواز ہے۔ اگرچہ مس احمد ایک سکول ٹیچر ہے بچپن اور جوانی ہی میں ہم جنسیت کی لذت سے آگاہ ہو کر اپنی بچپن کی چھ سہیلیوں، استانیوں اور اپنی کولیگ کے ساتھ معاشقے اس کی زندگی کا حصّہ اور ثمر ہے جب اس کا راز افشا ہوتا ہے تو اس شہر کا سکول چھوڑ کر دوسرے شہر شفٹ ہو جاتی ہے مگر نفسیاتی طور پر وہ اس غم کو دِل کے نہاں خانوں میں زندہ رکھتی ہے اور پھر پُر اسرار اذیت زدہ۔ اداس دنیا کی باسی بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر یہ عقدہ افسانے میں کھول دیتے ہیں کہ مس احمد کا المیہ جنسی یا جسمانی نہیں، نفسیاتی ہے بچپن اور جوانی کے گھریلو ماحول، ماں باپ کی بے اعتنائی اور سکول میں نسائی دلکشی اس کی نفسیات کا حصّہ بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ مردانہ جنس پرستی ایک عادت یا بیماری نہیں بلکہ یہ جذبہ انتقام کا نتیجہ ہو سکتی ہے جب پی ٹی ماسٹر پر چوری کا الزام لگا کر اسے بے

عزت کیا گیا تو وہ غضب ناک ہو رہا تھا۔ یہاں وہ نفسیاتی الجھنوں کا حل جنس میں ڈھونڈتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس بے عزتی کا بدلہ لیا جائے۔ مردانہ جنسی پرستی کے ذریعہ جنسی آسودگی اس کی ضرورت نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر اس کے جذبہ انتقام کی وجہ وہ غیض وغضب کا شکار تھا لہٰذا اس انتقام کی آگ اسے نفسیاتی طور پر ولن بنا دیا گیا جو مدّ مقابل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ پی ٹی ماسٹر کا یہ فعل ابنارمل کردار کا ردّ عمل ہے۔ ابھی وہ اس ذہنی کشمکش اور ابنارمیلٹی میں تھا کہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا اس کے کمرے میں آ گیا۔ اور اس نے ہیڈ ماسٹر سے بدلہ لینے کے لیے اس کے بیٹے سے بدلہ لینے کا سوچا۔ افسانے میں یہ منظر مکانی ماحول کی بجائے فکری ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس منظر میں ذہنی کیفیتوں لویوں لفظ پوش کیا ہے۔

> ''یہ سوکھا اور مریل سا لڑکا بھی تو اسی کتے کا پلا ہے وہ اسے گھورتا رہا اور اس کے ذہن میں اب ایک نیا خیال ابھر رہا تھا وہ ایک ایسا ارادہ باندھ رہا تھا جس کے لیے اسے ملازمت کی بھی پرواہ نہ تھی یہ ٹھیک ہے اب ہیڈ ماسٹر کا ستیاناس ہو جائے گا وہ دروازہ کی کنڈی لگا کر بولا اوئے خبیث دے پترا! جے توں چوں وی کیتی تے تیری ہڈیاں توڑ دیاں گا۔۔۔''(12)

یہی صورت حال احمد علی والے افسانے میں بھی ہے۔ جہاں احمد علی کا کردار دراصل غربت کی چکی میں لپٹا ہوا سکول ماسٹر ہے وہ اپنے شاگرد امتیاز کی بہن کو ٹیوشن پڑھانے جاتا ہے اور اپنی شخصیت کے منفی پہلوؤں، بدصورتی، محرومی کو پس پشت ڈال کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی شاگرد رقیہ اس سے محبت کرتی ہے دراصل رقیہ اسے بے وقوف بناتی ہے مگر جب ماسٹر احمد علی کو رقیہ کے کسی عاشق کا خط مطالعہ کرنے کے لیے ملتا ہے جس میں بدصورت ماسٹر کی ذات پر شکوک وشبہات کی بارش کی گئی ہے تو یہ تحریر ماسٹر احمد علی کو مفلوج کر دیتی ہے اب اس لمحے نفسیاتی طور پر اس کی جنس کا جذبہ انتقام کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ جذبہ انتقام اس کے جنسی جذبے کی آگ کو تیز کر دیتا ہے۔ اور اس کمزور لمحے میں رقیہ کے بھائی امتیاز (جو نرم ونازک شرمیلا۔ لجیلا اور سجیلا سجیلا لڑکا ہے) کی آمد ماسٹر کے اندر سویا ہم جنس جاگ پڑتا ہے اور پھر وہ امتیاز سے کہتا ہے۔

> ''سرد پانی اسے جلتے سینے میں ایک برمے کی طرح اترتا محسوس ہو رہا تھا وہ خود میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا۔ امتیاز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ماسٹر جی کی متغیّر حالت دیکھ کر وہ کچھ سہم سا گیا۔ کامران کے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے کندھے پکڑ لیے اور تھوک نگل کر جب وہ بمشکل بولا تو اس کی آواز محض کپکپاتی سرگوشی تھی''اگر ۔۔اگر تم میری بات مان لو تو میں امتحان میں تمہیں فرسٹ کرا دوں گا۔''(13)

یہ افسانہ دراصل لاشعور میں پوشیدہ ہم جنس پرستی کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس نوع کا ہم جنس پرست جس کا خود اسے احساس نہیں ہوتا ایک کمزور بحرانی لمحے میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور تسکین کا شدت سے احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کے بیشتر کردار جنسی ابنارمل ہیں اور ان ابنارمل کرداروں (جن کی بنیاد ہم جنسیت ہے) کے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے

> ''ابنارمل کرداروں کی تحلیل نفسی میرے خیال میں سب سے مشکل کام ہے کہ عام عقیدے کے برعکس محض لاشعوری محرکات کی عکاسی بھی کافی نہیں رہتی ہے بلکہ

اس مقصد کے لیے کہانی کار کو نفسی عوامل کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی اور اقتصادی محرکات کا احاطہ کرنا اور بھی ضروری ہوتا ہے۔ اُن سب پر مستزاد یہ ہے کہ خود کہانی کار میں بھی ایک خاص طرح کی ذہنی کشادگی اور وسعت نگاہی ہونی چاہیے۔ اس کی آنکھیں ہی کھلی نہ ہوں بلکہ ذہن کے دریچے بھی۔ نہ تو زندگی کو فارمولوں سے ماپتا ہو اور نہ ہی رنگین شیشوں کی عینک سے دیکھتا ہو بلکہ زندگی جیسی کہ وہ ہے اسے اسی روپ میں دیکھتے ہوئے اس کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہو۔ یوں کہانی کار میں وہ ذہنی لچک پیدا ہو جائے گی جس کی بنا پر وہ موتی کی تلاش میں انسانی فطرت کے کوڑے میں ہاتھ ڈالنے سے گریز نہیں کرے گا۔"(14)

یہ ابنارمیلٹی کئی رنگ اختیار کرتی ہے۔ مرد کو عورت اور عورت کو مرد بننے کا شوق اصل میں ایسی ہی ایک کیفیت ہے ایک نفسیاتی مرض ہے جو معاشرے میں عام ہے۔ مرد زنانہ لباس پہن کر اور عورت مردانہ لباس پہن کر اپنی نفسیاتی محبت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا یہ شعوری عمل دراصل ان لاشعوری محرکات کے تابع ہوتا ہے وہ عورت میں جنسی عدم توازن اور احساس محرومی یا نرگسیت کی بنا پر تخلیق ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے:

"صنفِ مخالف کا لباس اپنانے کی عادت ان لوگوں میں ہوتی ہے جو عموماً تعلیم یافتہ، حساس، سنجیدہ اور باذوق ہوتے ہیں بعض اوقات اذیت پسندانہ رجحانات اس کا باعث بنتے ہیں۔ بعض لحاظ سے ایک طرح کی خود لذتی ہے، نرگسیت یعنی الفتِ ذات کی وجہ سے بھی یہ پیدا ہو سکتی ہے۔ عورت بعض اوقات اس احساس کمتری سے چھٹکارے کے لیے مردانہ لباس اپنا لیتی ہے جس کی تلخی بحیثیت ایک عورت وہ وقتاً فوقتاً محسوس کرتی رہتی ہے۔ وہ مرد کو قوت اور اختیار کا دیوتا سمجھتی ہے سو مردانہ لباس اسی قوت اور اختیار کی علامت بن جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر لباس محض ستر پوشی کی چیز نہیں بلکہ اس سے بعض بہت گہرے نفسی تقاضے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسے تقاضے جس میں لاشعوری تسکین کے راز مخفی ہوتے ہیں اور یوں یہ کردار و شخصیت کی تفہیم کا ایک ذریعہ بن جاتے ہیں۔"(15)

"جلّے پاؤں کی بلی" کی نعیمہ گھر میں اس کا ساتواں نمبر تھا اس کی پانچ بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ وہ کوشش کرتی کہ بھائی سے برتر دکھائی دے وہ لڑکے لڑکی کی تفریق کی قائل نہ تھی۔ یہاں تک کہ سکول کی سالانہ سپورٹس ڈے میں وہ مقابلہ میں لڑکیوں کے گروپ میں حصہ لینے کی بجائے کلیم بھائی کے ساتھ دوڑ رہی تھی مگر احساسِ برتری کا شکار تھی۔ کالج کی لڑکیاں اسے "وحشی" "گنوار" اور جنگلی بلی کہہ کر پکارتی تھیں اسے خود مردانہ پن کا احساس تھا۔

"اس کے انداز و اطوار میں دن بدن مردانہ پن پیدا ہو رہا تھا لڑکیاں اسے غنڈی کہتی تھیں اسے بھی معلوم تھا لیکن چڑنے کی بجائے اس نے اپنے لیے خطاب جانا چند خاص لڑکیاں اس کی حلقہ بگوش تھیں جن پر وہ خوب رعب جھاڑتی ان کی بے عزتی کرتی اور جسے بغاوت پر آمادہ دیکھتی اسے حلقہ سے باہر کرتی۔"(16)

بعض اوقات بہن کے کہے ہوئے الفاظ اس کو خوش کر دیتے:

ڈاکٹر سلیم اختر نے اکثر افسانوں میں پیچیدہ نفسیاتی مسائل کا پس منظر سادہ اسلوب میں ذکر کیا ہے فرائڈ میں نفسیات کے پس منظر میں "توتا کہانی" میں بیگم جمال جیسی جبلت تنہائی کے عذاب اور احساس محرومی میں مبتلا ہے۔ توتا کہانی میں بظاہر جنس بے سکون کا اظہار ہوتا ہے مگر تنہائی کا عذاب اور بے بسی اور بے اختیاری اسے مرد کی طلب کی ڈیمانڈ کرتی ہے مگر یہ صرف اس کے لاشعور میں ہے۔ آئینہ بیگم جمال کا آئینہ نہیں بلکہ اس خاتون کا لاشعور ہے جو اپنے حسن اور خوش لباسی پر نازاں ہے اور اس کی داد لینے کی خواہش بھی ڈاکٹر سلیم اختر بیگم جمال کی خواہش کو "توتا" میں Impersonate کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ بیگم جمال کے ساتھ چونچالیاں کرتا ہے لیکن بیگم جمال جیون ساتھی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہائی کا شکار ہے۔

> "بیگم جمال کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا، سوائے جمال صاحب کے جو اس سے بالعموم دُور ایک دوسرے ملک میں کاروبار کیا کرتے، کاروبار کیا بس سونے کی کان تھا۔ لہٰذا بیگم جمال کی خوش قسمتی کی طویل فہرست کا آغاز تابع دار امیر جمال صاحب سے ہوتا تھا۔ سال دو سال بعد آتا تو محبت اور تحائف سے لدا پھدا۔ ہاں ایک بات تھی کہ خوش قسمتی کی اس فہرست میں بچوں کے نام نہ دیکھے جاسکتے تھے۔"(17)

بیگم جمال کے انفرادی کردار میں ڈاکٹر سلیم اختر نے بنیادی انسانی جبلتیں۔۔ بھوک، خوف، جنس اور غلبہ پسندی میں جنس کی جبلت کی شدت کو نمایاں کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ انساں اپنی جبلتوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے اگر وہ بے بس ہو جائے تو وحشی جانور بن جاتا ہے۔ توتا کہانی کے بارے میں ڈاکٹر نجیب جمال کا خیال ہے:

> "توتا کہانی کی بیگم جمال اپنی ناتمام خواہشوں کی تصویر ہے آئینہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی ہے۔ اور اس کے شوہر کی مستقل عدم موجودگی میں اسے مرد کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور جب اعصابی تناؤ سے بیگم جمال کا ذہن شہد کی بھنبھناتی مکھیوں کا چھتہ بن جاتا ہے تو ایک زرخرید توتا اپنی باتوں سے اس کے عذاب کو خواب آور گولی کیطرح پُرسکون کرتا ہے طوطے کے مشورے پر عمل کر کے ہی بیگم جمال ایک فیصلہ کرتی ہے۔ جمال نہ سہی دلدار مرزا ہی آئینہ اور طوطا دونوں ہی بیگم جمال کی خواہش ناتمام کی تکمیل کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہی کچھ کہتے ہیں جو بیگم جمال سننا چاہتی ہے۔"(18)

پاؤں کی جنت (Mental and Emotional Fixation) تعلیق ذہنی وجذبی کا نفسیاتی افسانہ ہے ہیرو ایک نفسیاتی مریض ہے اس کا نفسیاتی المیہ ہے کہ اسے پاؤں سے جنسی محبت ہے یہ دراصل پاپرستی Fetishism Fat داستاں ہے وہ والد کے سخت گیر رویّے سے خوفزدہ ہو کر ماں کی طرف کھنچتا چلا گیا یہاں تک کہ ماں کی عدم موجودگی وہ خوف اور عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا جب ماں کو "فیل پا" پاؤں کی بیماری لاحق ہوئی اور والدہ کی خدمت گزاری میں لگ گیا وہ ماں کی پنڈلیوں اور پاؤں کی مالش کرتا۔ اسی انہماک سے پاؤں اس کے ذہن پر نقش ہو گئے اور جنسی کج روی کا شکار ہو گیا۔ جب وہ عورت کی محبت میں غرق ہو کر اس عورت کو گھر لے آیا تو اس کے پاؤں چومنا اس کا انفرادی نفسیاتی عمل تھا مگر اس عورت کے لیے یہ نیا اور انوکھا تجربہ تھا ان فقروں میں یہ اعصابی بیماری کا واضع اظہار ہے۔

ڈاکٹر شاہین مفتی کے بقول:

"پابوسی کا یہ نفسیاتی مظہر ماں کے وجود کے تحفظ کی وہ نخست مثال ہے جس
نے اسے باپ کی سرد مہری سے محفوظ رکھا، یہ پاؤں اس کا احساس ملکیت بھی تھے اور
سلسلہ ارتکاز بھی، آخر کار یہی پاؤں اس کی نارمل زندگی کا نقطہ آغاز ثابت ہوئے۔"(19)

افسانہ بکری نفسیاتی Self Identification کی مثال ہے زرینہ ایک نامرد خاوند امجد کی بیوی جو اپنے آپ کو کنواری بیوی سمجھتی ہے۔ جو مامتا کے جذبات کی مالک ہوتے ہوئے ذہنی کرب اور نفسی الجھنوں کا شکار ہے وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ باہر گلی سے بچہ جنتی ہوئی بکری کی کربناک آوازیں سن کر ان آوازوں میں ایک انجانا تلذذ و اضطراب محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنے تحت الشعور میں تخیلی خود انتسابی Self Identification کے ذریعہ اپنے آپ کو بیوی کی جگہ بکری تصوّر کرتی ہے۔ اور پھر Delivery کی مسرت کا لذت انگیز کرب اپنے اوپر طاری کر لیتی ہے اور انجانی لذت سے آگاہ ہوتی ہے مگر اس کی بد دماغ ساس اسے بکری کی طرف متوجہ ہونے سے روکتی ہے۔ پھر بکری کا بچہ جننے کا خیال اس کے ذہن کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے اور وہ ذہنی طور پر بکری اور بکرے کا تعلق ذہن میں لاتی ہے۔ خاوند کا تصوّر کرتے ہی اسے مردانگی اور نامردی کے تضاد کا نشہ ہو جاتا ہے :

"۔۔۔اور جب وہ کھانا لیے خاوند کے کمرے میں داخل ہوئی تو کمرے کے
ملگجے اندھیرے میں اس کی آنکھیں قصائی کی دکان پر رکھی "سری" سے مشابہہ بے نور اور
مکروہ آنکھوں سے چار ہوئیں تو اس نے سوچا اے کاش وہ بکری ہی ہوتی اور اس نے کھانے
کو گھاس کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھا۔"(20)

ڈاکٹر سلیم اختر کے یہ سبھی کردار اور ان کی الجھنیں ان کو افسانے کا موضوع بنالیتی ہیں۔ ان کرداروں میں ہری ہری گھاس کا اعصابی تناؤ میں مبتلا سادہ لوح گاما کوچوان، روشن دن کا تاریک رات میں سفر کا خوفناک نائٹ میئر دیکھنے والا جمیلہ کا شوہر علامتی مرد کا کمزور مریل سا خوش بخت مردہ دھار والی مقراض کی گناہ گار لڑکی۔۔۔یہ سب کردار اعصاب کے بوجھ کے تلے دبے ہوتے ہیں۔ ایک اور اہم بات کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے تقریباً سارے کردار Individual ہوتے ہیں۔ Types میں ان کرداروں میں بکری کا زرینہ۔ سویٹ ہارٹ کی ویلما۔ اس رات کی خوشبو کا چیچک زدہ کلرک۔ 'غسل سے پہلے' کا کاظم خاں، زن مرید کا ماسٹر بشیر مس احمد بی اے بی ٹی کی رشیدہ احمد، تختہ مشق کا امجد علی کامران، موری کی اینٹ کی 'جنتے'، آئینہ کی نگار۔۔۔یہ سب انفرادی کردار ہیں یہ سب اپنے اپنے نفسیاتی لمحے میں مقید ہیں لمحہ ان کی تشکیل، تکمیل، ارتقا میں معاون بنتا ہے۔ ان کرداروں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں کرداروں کی اکثریت نچلے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سکول ماسٹر، کلرک، محبوبہ نما طوائفیں، کال گرلز، پارٹی گرلز، اینگلو انڈین گرلز شامل ہیں۔

خود ڈاکٹر سلیم اختر اس بارے کہتے ہیں کہ

"افسانہ افراد کو موضوع بناتا ہے اور ان سے ہی مکالمہ کرتا ہے اس ضمن میں
افسانہ نگار کے لیے یہ امر خاصی دقت کا باعث ہو سکتا ہے کہ معاشرہ پر تنوع افراد پر
مشتمل ہوتا ہے تو قوم بھات متی کا کنبہ اب افسانہ نگار کا خطاب کس سے ہو۔ لہٰذا کسی ایک
فرد یا خاص فرقہ کو مخاطب کیے بغیر عمومی انداز میں بات کرتا ہے۔ لیکن ہیت اور اسلوب
کا یہ کمال ہے کہ ہر قاری افسانہ کو اپنے لیے سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔"
(21)

یہ افراد افسانوں کی کرداروں کی شکل میں احاطہ تحریر میں آتے ہیں لیکن ان کرداروں کو صرف بیان کرنا ان کے ظاہری حسن یا بدصورتی کو بیان کرنا ڈاکٹر سلیم اختر کا مطمع نظر نہیں چونکہ وہ تحلیل نفسی کا گر جانتا ہے اس لیے وہ ان کرداروں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان کے دِل کی دھڑکنوں کو سن لیتا ہے اور ان کرداروں کی ان کیفیات کو اندازہ کر کے اکی اعصابی محرومیوں کو سامنے لے آتا ہے۔ اگر ان کرداروں کا انفرادی طور پر نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو سلیم اختر کے مشاہدے علم نفسیات سے آگہی اور کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں سے ادراک کا احساس ہوتا ہے۔

مس رشیدہ احمد جس کو مس احمد بی۔ اے بی ٹی افسانے میں ایک نفسیاتی کردار کے روپ میں سامنے آتی ہے اس کی ہم جنس پرستی اس کی عادت بیماری نہیں کیونکہ وہ غیر معمولی ذہن کی مالک ہے۔ جو قانونی۔ اخلاقی یا سماجی مجرم نہیں کہلائی جاسکتی۔ ہم جنسی پرستی کا یہ راستہ اس کی ذاتی کاوش نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر وہ حالات کی پیدا کردہ الجھنوں اور مسائل میں گھری ہوئی ہے اور اب نارمل سے ابنارمل کردار میں تبدیل ہو کر وہ نفسیاتی مریض بن چکی تھی اس کی حالت ایسی تھی۔ جلے پاؤں کی بلّی کی نعیمہ ایک ایسا نفسیاتی کردار ہے۔ حالات نے نہیں بلکہ اس کی نفسیات میں کچھ نیا پن، کرنے کی جستجو اسے مردانہ خصوصیات عطا کرتا ہے وہ گھر میں ساتویں نمبر پر تھی پانچ بہنوں اور ایک بھائی کی پیدائش کے بعد نعیم کی بجائے نعیمہ پیدا ہوئی اگرچہ ہمارے معاشرے کی ریت کے مطابق خاندان میں اکلوتے لڑکے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس ایک رویہ نے نفسیاتی طور پر اسے کلیم بھائی سے برتر ہونے کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ کوشش کرتی کہ وہ ہر میدان میں بھائی سے آگے بڑھ جائے سکول کے سالانہ کھیلوں کے مقابلے ہوں یا ریڈ کراس کے ورائٹی شو میں وزیر کا کردار یا مردانہ لباس زیب تن کر کے سامنے والی کھڑکی میں کھڑی لڑکی کی نظریں جو اس پر عاشق ہو گی تھی۔ نعیمہ مردانہ وضع قطع، چال ڈھال، انداز و اطوار، لب ولہجہ، حرکات و سکنات اختیار کرنے کا شعوری عمل اس کے لاشعوری محرکات کے تابع تھا۔ تو تا کہانی کی بیگم جمال ایک امیر مگر تنہا خاتون ہے جسے اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا سوائے جمال کے جو اس سے دور ایک دوسرے ملک میں کاروبار کیا کرتے۔۔۔ دو سال بعد (امیر جمال) آتا تو محبت اور تحائف سے لدا پھدا۔۔۔ ہاں ایک بات تھی کہ خوش قسمتی کی اس فہرست میں بچوں کے نام نہ دیکھے جاسکتے تھے۔ افسانے میں نفسیاتی طور پر بیگم جمال کی شخصیت کے دو حصّے ہیں ایک وہ جو سمندر پار ملک میں رہ کر اس کا نام نہاد خاوند کہلاتا ہے۔ دوسرا 'طوطا' جو اس کی مخفی خواہشات کا روپ دھار کر اس کا مشیر بن کر اس کی جنسی، نفسیاتی اور جسمانی خواہشات کی تکمیل کا راستہ دکھاتا ہے۔

خبیث دا پُتر کا پی ٹی ماسٹر ایک نارمل کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جو اپنی ڈیوٹی نبھاتا ہے اور ہیڈ ماسٹر کو خوش کرنے کے لیے اس کے گھریلو کام بھی نبٹاتا ہے۔ مگر اسے نفسیاتی طور پر یہ 'شاک' ملتا ہے کہ وہ جو رہے تو اس کے اندر کا "ٹریفک کانسٹیبل" انتقام کی آگ میں جھلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی نفسیات میں گناہ یا جرم نہیں بلکہ انتقام کی آگ جل رہی ہے اب وہ نارمل سے ابنارمل ہوتا جا رہا ہے جسے کچھ ہوش نہیں کہ وہ اخلاقی جرم کرنے جا رہا ہے۔ چونکہ وہ ہیڈ ماسٹر سے انتقام لینا چاہتا ہے مگر ہیڈ ماسٹر کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس لیے اپن انتقام اس کے بیٹے سے لیتا ہے۔ انتقام کا یہ عمل لاشعور کے ماتحت ہے۔

پاؤں کی جنت کا بیٹا میں وہ ماں کے پاؤں کی محبت کا اسیر تھا چھوٹی عمر سے ہی فیل پا میں مبتلا مریضہ ماں کے پاؤں دبانے پڑتے تھے یہیں سے اس کے لاشعور میں پاوں نے جنسی تسکین کے عمل کو پختہ کیا۔ اعصابی طور پر پاؤں اس کے سر سوار تھے وہ سڑک پر کھڑے ہو کر من موہنے پاؤں دیکھتا رہتا۔ عورتوں، لڑکیوں یا نوخیز لڑکوں کے پاؤں کے سیلاب پر نگاہیں جمائے رکھتا اسی Foot Fetishism کی وجہ سے جنسی کج روی کا شکار ہو گیا اور جب اسے طلب ہوئی تو ایک کرائے کی عورت گھر لے آیا۔ اور بجائے جسمانی تسکین حاصل کرنے کے وہ پابوسی کا نفسیاتی خطیر کرنے لگ گیا اور اس عورت کے پاؤں چومنے لگا۔

"جب وہ نہ بیٹھی تو اس نے دھکا دے کر اسے بٹھا دیا۔ اس نے چارپائی کی پائنتی بیٹھ کر اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھ لیئے۔ "یہ کیا؟" مگر اب وہ پورے انہماک سے سینڈل اتار رہا تھا۔ عورت نے پاؤں کھینچنے کی کوشش کی مگر اس نے انہیں اپنی گود میں جکڑ لیا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر نشے میں ڈوبے اعصاب کے لیے وہ محض مکھیوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ " چپ رہو' چپ رہو۔ " وہ ہانپتا ہوا بولا۔

"اس نے شلوار کے پانچے پنڈلیوں تک اٹھا دیئے۔ اس کا اندازہ غلط نہ تھا متناسب پنڈلیاں وہ خوبصورت پاؤں پر آکر ختم ہوتی تھیں۔ وہ ایک لمحہ کو کسی فنکار کی مانند انہیں نیم وا آنکھوں، کھلے ہونٹوں اور تیز سانسوں سے دیکھتا رہا اور پھر وہ انہیں دیوانہ وار چومنے لگا۔"(22)

"بنجر مرد اور زرخیز عورتیں" کی جمیلہ کی نفسیاتی کمی کی وجہ سے اپنی سہیلی فرزانہ کو سوت بنا کر لے آتی ہے یہاں وہ فطرتاً عورت کی شرم وحیا میں لپٹی اور نفسیاتی اور جنسی طور پر بیدار جمیلہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنس پرستی کا شکار ہوتی ہے۔ اس کی نفسیاتی الجھن کا علاج بدنامی سے بچاؤ اور گھریلو سکون میں ہے۔ " آئینہ کی نگار" کا نفسیاتی مسئلہ اس کی بدصورتی ہے اور آئینہ سے نفرت اس کی نفسیاتی الجھن کی وجہ ہے۔ وہ اکثر آئینے میں اپنے ماضی کا حسین چہرہ اور حال کا بدصورت چہرہ کا موازنہ کر کے احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کا چڑچڑا پن اس کی نفسیاتی الجھن کا رد عمل ہے مگر اپنے بدصورت ملازم فضلو سے گفتگو سے وہ نفسیاتی تسکین حاصل کرے کی کوشش کرتی ہے مگر فضلو ان پڑھ اور جاہل مرد ہے اسے نہ تو بدصورتی کا احساس ہے مگر نگار کی نظروں میں وہ خوش بخت ہے اور اسی تقابل سے وہ رونا شروع کر دیتی ہے۔

"زن مرید" کا ماسٹر بشیر احمد بی۔ اے کا کردار نفسیاتی کش مکش میں مقید آدمی کا کردار ہے جو گھریلو قسم کا خاوند ہے جس کی زندگی سکول میں درس و تدریس اور گھریلو معمولات میں الجھی ہوئی ہے۔ جو دراصل ایک زنداں میں گرفتار ہے اور باہر کی دنیا اس کے لیے نامانوس ہے۔ جب سکول کے لیے سپورٹس کا سامان لینے لاہور جاتا ہے تو ایک آوارہ شخص اسلم اسے لذت گناہ سے آشکار کرنے اور ساٹھ روپے بیوی کی فیس لے کر اسے لذت کے کنوئیں میں دھکیل دیتا ہے تو اس کی نفسیاتی الجھن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اپنی شرافت پر استادہ دیوار میں شگاف پڑتا احساس گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور احساس گناہ کو مٹانے کے لیے وہ بیوی کے لیے سوٹ کا کپڑا خریدتا ہے اور اس سے وہ نفسیاتی طور پر اطمینان محسوس کرتا ہے۔ " تختہ مشق" کا ماسٹر احمد علی اپنی شاگرد رقیہ کو ٹیویشن پڑھاتے ہوئے خود فریبی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی بدصورتی کی پروا کیے بغیر رقیہ کی طرف سے محبت کی آفر کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے مگر رقیہ کسی دوسرے لڑکے کے نام خط میں اس کی انا اور خلوص کو ٹھیس پہنچاتی ہے تو وہ انتقام کی آگ میں پاگل ہو جاتا ہے۔ یہ ابنارمیلٹی کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر انتقام کا جذبہ جنسی حملہ میں تبدیل ہو جاتا ہے رقیہ کا بھائی ویسے بھی بڑا شرمیلا اور سجیلا ہے۔ لہٰذا ماسٹر احمد علی اپنی انتقامی کی آگ کو سرد کرنے کے لیے لذت گناہ میں شریک ہو جاتا ہے۔

"بیوی کا الاؤ" میں ناظم کا کردار نفسیاتی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا شکار ہے جسمانی لحاظ سے وہ مکمل مرد ہے مگر بیوی کے حسن سے مغلوب ہر کر نفسیاتی مریض بنتا جا رہا ہے اگرچہ اس کا دوست ڈاکٹر لطیف اس کا جسمانی علاج کرتا ہے مگر وہ بیوی کے مقابلے میں خود کو کم تر سمجھتا ہے حالانکہ وہ یہی عمل کنجریوں، فقیرنیوں اور مزدور عورتوں کے ساتھ سرانجام دے چکا ہے مگر بیوی کو دیوی سمجھ کر اسے گندہ کرنا نہیں چاہتا جب بیوی کی درد بڑھتی ہے تو دوست ڈاکٹر لطیف کو لے کر آتا ہے اور خود ایسے فعل کا ارتکاب ہوتا ہے جو نارمل آدمی نہیں کر سکتا مگر وہ نارمل

سے بڑھ کر ابنارمل ہو چکا ہے اور اس کیفیت میں وہ نفسیاتی الجھن کو دور کرنے کے بعد بیوی کو ڈاکٹر کے حوالے کر دیتا ہے۔ دونوں کو ایک کمرے میں چھوڑ کر یہ کہتا ہوا چلا جاتا ہے

"آپ اطمینان سے اسے دیکھیں میں آپ کے لیے کوکا کولا لے آتا ہوں۔"

(23)

ماں بیٹا کا عبداللہ ایک اچھوتا کردار ہے جو فرائیڈ کے فلسفہ ایڈی پلس کی عملی تصویر دکھائی دیتا ہے ماں اور بیٹے کی فطری محبت فرائڈ کے نزدیک مخالف جنسوں کی جنسی کشش ہے عبداللہ کا کردار ماں کی محبت کے سمندر میں موجزن ہے۔ "بکری" کی زرینہ ایک ایسا نفسیاتی کردار ہے جس کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے نامرد خاوند اور کنواری بیوی کے ملاپ کو سمجھنا ضروری ہے۔ مامتا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا تعلق ماں کی تخلیق کردہ اولاد سے ہے۔ اور اگر محبت نارمل بیوی کا مجازی خدا عورت کی سرسبز زمین کو آباد نہ کر سکے تو اس کیلی ہوئی مامتا کی ماری عورت کے جذبات یا تو غیر اخلاقی عوامل کی طرف راغب ہو سکتے ہیں یا وہ نفسیاتی گھٹن کا شکار ہو کر مامتا کے جذبات کسی جاندار (چاہے وہ بکری ہو) کے لمحہ تخلیق اور اس کے کرب کو محسوس کرتی ہے۔ زرینہ کی نفسی الجھنیں اس کی ذہنی حالت اور جذباتی وابستگی افسانے کی جان ہیں یوں زرینہ ایک کنواری بیوی بن کر نفسیاتی خود انتسابی (Psychological self Identification) کی مثال ہے۔

المختصر ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانوں میں رشیدہ احمد (مس احمد بی۔اے بی ٹی) جمیلہ (بنجر مرد اور زرخیز عورتیں) نعیمہ (جلے پاؤں کی بلّی) بیگم جمال (توتا کہانی) ماسٹر بشیر (زن مرید) زرینہ (بکری) ماسٹر عنائیت (پابندی وقت کے فوائد) عبداللہ (ماں بیٹا)۔۔سب کردار نفسیاتی کردار ہیں وہ جنس زدہ ہوں یا جنس گریز۔۔۔ مرد ہو یا نامرد، مردانہ ہم جنسی میں ملوث ہوں یا زنانہ ہم جنسی (Lesbianism) میں مبتلا ہوں۔ سب کسی نہ کسی نفسیاتی پیچیدگی کا شکار ہیں ڈاکٹر سلیم اختر کے نفسیاتی کرداروں کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر نیر صمدانی کی رائے ہے:

"سلیم اختر کی افسانہ نگاری محض جنسی حادثوں اور ان کی توجیہات پیش کرنے تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع نسبتاً زیادہ ہے اس کی وجہ تمدنی زندگی کا ارتقا بھی ہے جو نفسیاتی اور حشیاتی الجھنوں کو مسلسل آگے بڑھا رہا ہے۔"

(24)

ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیات کے ماہرین کا مطالعہ بھی کیا ہے لہٰذا مطالعہ کے اثرات ان کے افسانے میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سگمنڈ فرائڈ کا فلسفہ، شعور لاشعور اور تحت الشعور، تحلیل نفسی، گستاو ژونگ کا نظریہ خواب بیداری، الفریڈ ایڈلر کا نظریہ، احساسِ کمتری کے اثرات نمایاں ہیں۔ یوں ڈاکٹر سلیم اختر کے ہاں زندگی کا گہرا مطالعہ نفسیاتی بنیادوں پر نظر آتا ہے۔ خود بحیثیت افسانہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ کہانی کار کو انسانی زندگی کا عمیق مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"انسانی زندگی کا مطالعہ کرنے سے انسان میں کوئی نہ کوئی عجب انوکھی خصوصیت نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں بعض نفسی پیچیدگیاں اور اُلجھی کیفیات اسے کچھ کا کچھ بنا دیتی ہیں۔ کہانی کار کے لیے ایسے پیچیدہ کرداروں کی کامیاب تخلیق بہت مشکل کام ہے، ایسے کردار اس کے تخلیقی شعور اور فنی پختگی کے لیے سب سے بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔"(25)

مجموعی طور پر دیکھیں تو ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے جنسی نہیں بلکہ نفسیاتی ہیں جن میں بنیادی استعارہ جنس بنتی ہے، لیکن اصل مسئلہ نفسیاتی ہوتا ہے یوں ڈاکٹر سلیم اختر نے جنس کے مختلف پہلوؤں مثلاً نسائی ہم جنسیت (Lesbanism) ، مردانہ ہم جنسیت (Homosexualism)، سادیت پسندی، اذیت پسندی (Sadism) ،جنسی سادیت پسندی (Sexual Sadism) ، خیبت (Frustration)، رجعت پسندی (Regression) ، یاسیّت پسندی (Pessimism) ، احساسِ کمتری/ محرومی (Inferiorty Complex)،عدم تحفظ کا احساس، خوف کا ہیجان، نرگسیت، پاپرستی (Foot Fetishism) ،اعصابی تناؤ (Depression) ،حسد اور جذبہ رقابت (Jelousy) ،جذبہ بغاوت واشتعال (Violance) جیسے نفسیاتی مسائل پر مبنی افسانے قلم بند کیے۔ ان افسانوں میں مرد و زن کے مختلف رویوں کا ذکر ہے۔ ہم جنسیت (Homosexualism) کا ذکر محض فحش نگاری کا اظہار نہیں بلکہ مختلف ابنارمل کرداروں کے رویوں کا ذکر ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے نفسیاتی اور جنسی افسانوں میں نفسیاتی مسائل جو جنسی جذبات سے اجاگر ہوتے ہیں کو معاشرتی انداز سے بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ یوں ڈاکٹر سلیم اختر نے جنس کے ساتھ ساتھ معاشرے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ پاکستانی معاشرہ مثالی ہے یہاں کے مسائل تیسری دنیا کے پس ماندہ ممالک کے مسائل سے کم نہیں۔ ملکی صورتِ حال میں سیاسی اور غیر سیاسی مسائل کے انبار کا سامنا ہر فرد کو ہے۔ انھیں معاشی ناہمواریوں، جاگیر دارانہ نظام کی گرفت، پدری معاشرے میں عورت ذات پر ظلم و ستم، اخلاقی گراوٹ کا سامنا بھی ہے مگر سلیم اختر اِس معاشرے کی منفی صورت حال کا اخبار نویسوں کی طرح تجزیہ نہیں کرتے بلکہ اِس صورت حال کی نفسیاتی وجوہات کے پس منظر میں افسانے میں اس صورتِ حال کو پیش کرتے ہیں۔ وہ برملا اِس بات کا اظہار کرتے ہیں:

> ”حالات کے ڈیپریشن نے تو قنوطی بنا دیا ہے۔ خون آشامی، اجتماعی جنون، عقیدہ اور مسلک کی نصرت بنیاد پرستی کی کانٹوں بھری فصل اور مذہب کا پیدا کردہ خوف۔ اس خوف کا پیدا کردہ تناؤ اور اِس تناؤ کا پیدا کردہ اعصابی خلل ہے تو اس کے افسانہ نگار کے لیے چیلنج اور تخلیقی تناظر“(26)

ڈاکٹر سلیم اختر خود پاکستانی معاشرے کی اِس بدحالی اور زبوں حالی کا تجزیہ بھی کرتے ہیں:

> ...”گلیاں سنسان، بازار بے رونق، شاہ عالمی تقریباً کھنڈر۔ پنجاب، دہلی اور یو پی کے مہاجرین اپنی اپنی بولیوں، یادوں، غموں اور دکھوں کے ساتھ ہرج مرج کھینچتے آ رہے تھے... کیمپوں میں کھانوں کی دیگیں لے جاتے اور ہر طرح کے مہاجرین کی مدد اور دل جوئی کرتے۔ تب اندازہ نہ تھا کہ قلیل مدت میں پاکستان اسی دیگ میں تبدیل ہو جائے گا جو ہر وقت آگ پر ابلتی رہے گی اور جس کے چاولوں کا نہ ایک رنگ ہو گا نہ ایک ذائقہ! کرپشن، رشوت لیے، عدم عدل کی وجہ سے آج پاکستان کینسر کے مریض سے مشابہہ نظر آتا ہے تو یہی وہ ٹیڑھی اینٹیں ہیں جن پر اس ملک کی بنا استوار کی گئی، شہیدوں کے خون کے ساتھ بل کہ جس ارزاں نرخ پر خون شہدا کی سوداگری ہوئی، وہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔“(27)

اس معاشرتی صورت حال کو پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر سلیم اختر کا افسانہ ''بچہ جمورا'' بہترین مثال ہے۔ اس مکالماتی افسانے میں عامل اور معمول کی گفتگو سے معاشرے میں سماجی رویوں پر طنز کی گئی ہے۔ اس افسانے میں جمورے کے کردار کو علامت بنا کر معاشرے کے دیگر افراد کے رتبے اور سماجی رویوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں کوئی دولت کے حصول کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ کوئی دن دہاڑے پاکٹ مار رہا ہے تو کوئی وقتِ شب چوری چکاری میں مصروف ہے۔ گھر اور گلیاں گندگی سے بھری ہوتی ہیں۔ بچوں کی اغوا کی واردات عام ہیں اور چاقو سے مخالفین کو قتل کیا جارہا ہے۔ تماشے میں ایک لمحہ ایسا ہی آتا ہے جب بچہ جمورا مداری کے فن اور ہنر کی بدولت ایسی دھرتی جا پہنچتا ہے جہاں محبت، الفت، سکون اور حسن سلوک ہے، تو وہ وہیں قیام کا ارادہ کرتا ہے، یوں بچہ جمورا مداری سے زیادہ عقل مند دکھائی دیتا ہے۔

''درد کا بندھن'' ہمارے معاشرے کے گھر گھر کی کہانی ہے جس میں دو خواتین ساس اور بہو کی روایتی چپقلش کا افسانہ ہے جس میں مردانہ کردار یعنی خاوند، ماں اور بیوی کے چکی کے پاٹوں کے درمیان جذباتی طور پر پس رہا ہے لیکن اس میں فیصلہ کرنے کی قوت نہیں کہ وہ دونوں کو ایک ہی راہ پر روانہ کر سکے۔ لیکن اس کی موت دونوں کرداروں کو دکھ کے سمندر میں ڈبو کر ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کھڑا کرتا ہے۔ افسانے میں گھریلو فضا اور اندرونی ماحول کی تصویر کشی افسانہ نگار کے گہرے مشاہدے کی عکاس ہے۔ افسانے کا ایک منظر دیکھیے جہاں بیوی کے ساس کے بارے میں خیالات کو گھریلو زبان میں پیش کیا گیا ہے جس میں روایتی بیوی کا گھریلو زبان میں خیالات طنزیہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں:

> ''اس مردار بڑھیا نے ایسے تعویذ کئے کہ میرے خاوند کا دل ہی نہ پھیرا۔ اس کی زندگی ہی ختم کر دی۔ منحوس بڑھیا... اگر بیٹے سے ایسا ہی پیار تھا تو بیاہ رچانے کیوں بھاگی بھاگی آئی تھی۔ مکار! کیسے مجھے پیار کرتی اور واری صدقے جاتی تھی۔ مکار عورت! بیٹے کے منہ پر میری تعریفیں اور پیچھے سے بھڑکانا، اس کے کان بھرنا۔ اُف ماں ساس بن کر ناگن کیوں بن جاتی ہے۔ کیسے بل کھولتی ہے، انہیں کتنا پیار تھا اس کٹنی سے، شاید مجھ سے دوگنا۔ مگر مجھے پھر بھی شکایت کیوں ہو۔ وہ نامکمل پیار ہی میری بہار تھی۔''(28)

''سفر سے واپسی'' اس میں معاشرے کی اجتماعی نفسیات کے اِس پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے جس میں انسان زندگی کے کسی اعلیٰ زینے پر اتنا بلند تر ہو جاتا ہے کہ اس کا ماضی سے رابطہ شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماضی سے رشتے میں پہچان ہوتی ہے جس فرد کا رشتہ ماضی سے کٹ گیا، وہ جی نہیں سکتا، چاہے اس کا ماضی کا تعلق کچے مکانات، بدبودار، نالیوں اور تنگ و تاریک گلیوں سے ہی کیوں نہ ہو۔ شیخ غلام علی ٹھیکیدار نو دولتیہ طبقے کا فرد ہے جس کا المیہ یہ ہے کہ وہ اندرونِ لاہور سے اُٹھ کر اعلیٰ طبقے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ شیخ غلام علی کا ملازم فضلو صاحب کے اس اعلیٰ طبقے کے ماحول سے مانوس نہیں بلکہ وہ اسے ناپسند بھی کرتا ہے۔

> ''یہاں کیا رکھا ہے۔ یہ کھلی بڑی بڑی کوٹھیاں جن میں چھوٹے چھوٹے لوگ۔ لوہاری جیسی گندی گلیوں سے اٹھ کر آئے اور اب بڑا بننے کی کوشش میں ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ سب بونے ہیں جو محلوں اور قلعوں میں رہنے کو آ گئے ہیں۔''(29)

ڈاکٹر سلیم اختر، شیخ غلام علی ٹھیکیدار کی صورت میں پاکستانی معاشرے کے دولت کے پجاریوں کے لیے کہتے ہیں:

> ''شیخ صاحب بھی ان بہت سے پاکستانیوں جیسے تھے جنہیں زندگی میں پہلی مرتبہ دولت کو رشوت، شراب اور عورت کی صورت میں خرچ کر کے، مزید دولت کمانے

کی طاقت اور، اس طاقت کی لذت کا نشہ ہو چکا تھا۔ وہ یوں محسوس کرتے گویا یہ مملکتِ خداداد ایک وسیع مرغزار ہے جس میں انہیں ایک آزاد ہرن کی مانند چھوڑ دیا گیا ہے جس جھاڑی پر چاہے منہ مارے جس کنج میں چاہے آرام کرے۔ جس درخت سے چاہے سینگ بھڑا دے۔ وہ دل کھول کر لوگوں پر خرچ کرتا اور دل کھول کر وصول کرتا۔ کسی امیر کی بیٹی کی شادی میں زیورات کا سیٹ تحفہ میں دیا تو شاپنگ کرا کر کسی ایکس ای این کی بیوی کو کار دلا دی، کسی کے پاس فلیش میں دو چار ہزار روپے ہارا تو کسی کے لیے کمرہ، عورت اور شراب کا بندوبست کیا۔ کسی کے بیٹے کو کالج میں داخلہ دلوا رہا ہے تو کسی کے سالے کی ضمانت کروا رہا ہے۔ اس محنت کا پھل یہ ملا کہ چند سال کے اندر اندر اس کی فرم کو بڑے بڑے سرکاری ٹھیکے ملنے لگے۔ چھوٹے موٹے نہیں لاکھوں کے ٹھیکے، اب اگر پہلی بارش میں چھت کا لینٹر ٹوٹ جائے تو اس میں شیخ صاحب کا کیا قصور، یا سیلاب کے ایک ہی ریلے میں پُل بہہ جائے تو شیخ صاحب کیا کریں۔ آج کل سیمنٹ ہی ریت ملا ملتا ہے۔"(30)

معاشرے میں معاشرتی مسائل، اقتصادی بے اعتدالی اور اخلاقی گراوٹوں کا تذکرہ، سانتا کلاز میں نمایاں ہے۔ ۲۵ دسمبر کرسمس کا متبرک دن ہے۔ جب سانتا کلاز سرخ چوغہ پہن کر ایک تھیلے میں بچوں کے لیے تحائف لے کر گلی گلی گھومتا ہے۔ جب لاشعوری طور پر وہ خوف زدہ ہے۔ سانتا کلاز ایک آئینہ بن جاتا ہے جس میں ہم معاشرتی بحران میں گھرے ہوئے لوگوں کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ سانتا کلاز کی پہلی ملاقات ایک خوفزدہ بچی سے ہوئی جس کی ماں کرسمس کے دن بے رحم اور وحشی مردوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ جب سانتا کلاز سے اس عورت کی لٹی ہوئی عزت کا مطالبہ کیا گیا مگر اس کا سانتا کلاز کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سانتا کلاز کی ملاقات ایک شاعر سے برسوں بعد ہوئی جس نے سانتا کلاز کی تحفہ میں دی گئی کتاب کا مطالعہ کیا اور اس کے مطالعہ سے شاعر کے قلب و نظر روشن ہو گئے مگر اسے اس کی کڑی سزا بھگتنی پڑی۔ یہ دراصل ہر دور کے سقراط کی کہانی ہے جہاں حق گو اور سچے افراد کو دردناک انجام کا سامنا ہے۔ سانتا کلاز کی ملاقات مذہب کے نمائندہ فرد دینی مبلغ سے ہوتی ہے جو اپنی لچھے دار تقریر میں سامعین کو حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے مگر اس کے قول و فعل میں تضاد ہے جس کا برملا اظہار وہ خود کرتا ہے۔ اسی طرح سانتا کلاز کی مجرم سے ملاقات میں احساس جرم، پچھتاوا اور اقبالِ جرم کرنے کے باوجود بے بس ہے کیونکہ اس کا ضمیر مر چکا ہے۔ اس کش مکش میں وہ اضطراب کی کیفیت کا شکار ہے جہاں افسانہ نگار نے معاشرے میں دو افراد کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ایک پیشہ ور مبلغ جس کا رویہ منافقانہ ہے دوسرا پیشہ ور مجرم جو برائیوں کا ارتکاب اور اظہار کرتا ہے۔ دونوں ہی معاشرے کے مختلف اور متضاد رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ سانتا کلاز کی آخری ملاقات قانون کے محافظوں سے ہوتی ہے جو اس کو بہروپیا سمجھ کر قید کر دیتے ہیں۔ ایک ایسا فرد جو بچوں میں خوشیاں بانٹنے نکلا تھا، معاشرے کے قانون کے نام نہاد محافظوں کے ہاتھ مقید کر دیا گیا۔ یہ افسانہ دراصل تلخ معاشرتی حقائق اور دوہرے معیار کی بہترین مثال ہے جس سے سانتا کلاز کو آئینہ بنا کر معاشرتی تضادات کی وحدت میں پرو کر معاشرے کی قبیح صورت کو نمایاں کیا ہے۔

'لب پہ آتی ہے دعا' میں معاشرے کی منافقانہ رویوں کی عکاسی کا نمونہ ہے جس میں نمازیوں کی ہر دعا کے ساتھ 'آمین' کی آواز مدھم پڑنی شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر معدوم ہو جاتی ہے کیونکہ موجودہ معاشرے لوگوں میں مذہبی فرائض ادا کرنے کا ادراک تو ہے مگر عملی طور پر وہ اِس فرائض کے احکامات سے غماض برتتے ہیں۔ مثلاً مولوی صاحب کی دعا اور سامعین اور حاضرین کا رویہ قابلِ غور ہے:

"اے خدا! پاکستان میں سے رشوت کی لعنت ختم کر دے۔" عید گاہ کے چند نمازی "آمین!!"، "اے خدا! ہمیں رزقِ حلال کی توفیق عطا فرما۔" عید گاہ کے چند نمازی "آمین"۔ "اے خدا رزقِ حرام سے محفوظ رکھ۔" عید گاہ کے چند نمازی "آمین"، "اے خدا! سفارش کی لعنت سے نجات دلا۔" عید گاہ کے چند نمازی "آمین"(31)

"میاں بیوی اور جیمز بانڈ" معاشرتی افسانوں میں ازدواجی پہلوؤں کا افسانہ ہے۔ یہ دراصل مغربی اور مشرقی تہذیبوں کے تصادم کی کہانی ہے جہاں بیوی آزاد مغربی ماحول میں پرورش پانے والی گھٹن کا شکار ہے اور اپنی فطرت کے مطابق ماحول چاہتی ہے مگر اس ماحول کی عدم دستیابی کے ردِّ عمل کے طور پر اس نے اپنی نفسیاتی تسکین کے اور راستے تلاش کر لئے۔ اگرچہ یہ امر اس مغربی ماحول کی نمائندہ کے لیے ممنوعہ نہیں مگر مشرقی تہذیب کا نمائندہ اس آزادی کا قائل نہیں۔ یہ افسانہ ایک طرح سے خاوند کی بے بسی کی کہانی ہے جو کہ بے بس خاوند کے ہاتھوں ان کی مذموم اخلاقی عادات کے دباؤ تلے دب کر اعصابی تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں افسانہ نگار "میں" کی شکل میں موجود ہے۔ وہ بھی ایک طرح کا جاسوس ہے۔ بی 'ملزمہ' کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش میں مصروف مگر وہ مغربی حسینہ اسے گمراہ کر کے کسی فلیٹ میں گھس جاتی ہے:

مذہب کے نام نہاد ٹھیکیدار اور ملّا اور ملّائیت سے منسلک منفی کردار بھی ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کا موضوع رہے ہیں۔ رزقِ حلال کے استاد کرم داد کی زندگی کو معاشرہ کا عکاس بنا کر معاشرے میں موجود مسائل اور رویّوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ماسٹر کرم داد ایک سخت گیر استاد تو تھا ہی مگر پیٹ پوجا میں ہمہ وقت مصروفیت بھی اس کا خاصہ تھا۔ اگرچہ وہ اسلامیات کا استاد تھا مگر اس کی زبان سے آیات سے زیادہ گالیوں کے فوارے پھوٹتے تھے۔ استاد شاگرد کا رشتہ تو موجود ہے مگر علمی نہیں جو کچھ استاد نے پڑھایا، شاگرد اِس سے بے زار ہو گیا اور اخلاقی اقدار کا پرچار کرنے والا کرم داد انہی معاشی مسائل کو حل کرتے ہوئے داتا دربار کے باہر پنج سورے اور دعائے گنج العرش فروخت کرتا نظر آتا ہے مگر ایک شاگرد سے ملاقات اور مشورے کے بعد وہ فحش کتابوں کا ناشر بن گیا۔ اس افسانے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب کبھی پیشہ نہیں بن سکتا اور نہ ہی مذہبی کتب کا کاروبار نفع بخش ہو سکتا ہے لیکن معاشرہ بحیثیت مجموعی مادیت پرست اور معاشی مسائل کے حل کا متمنی ہے۔ ویسے بھی لوگوں کا رجحان مذہبی کتب کے مطالعہ سے زیادہ غیر مذہبی اور چٹخارہ پیدا کرنے والی کتب کے مطالعہ کی طرف زیادہ ہے۔ اس لیے ماسٹر کرم داد کے درس کا طلبہ پر اثر نہیں ہوتا۔

"ہمارے ملک کا تو ستیاناس ہو گیا ہے۔ اس قدر بے حیائی ہو گئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ لڑکیاں دوپٹوں کے بغیر چھاتیاں مٹکاتی چلتی ہیں۔ لباس ہیں تو ان میں بھی بے حیائی آ گئی ہے۔ پردہ رہا نہیں نہ آنکھ کا اور نہ جسم کا۔ ہر طرف سینما ہیں جن میں گندی گندی انگریزی فلمیں چلتی ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں۔ ظلم خدا کا منہ چومتے مرد و عورت کے اشتہار کھلے بندوں لگتے ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں۔ گندا ادب گھر گھر غلاظت بکھیر رہا ہے جسے دیکھو گندی خواہشات کے پیچھے دیوانہ وار پھر رہا ہے۔ کیا پاکستان اس ناپاکی کے لیے بنا تھا کہ عورتیں بے حیا ہوں اور مرد بے غیرت۔ ارے! ان سب کو تو سرِعام گولی سے اڑا دینا چاہیے۔ ان کی سزا تو جہنم ہے، سب کو سنگسار کر دو۔ یہ سب ہماری گندی فلموں کا قصور ہے اور اس سے بھی بڑھ کر مغرب سے آنے والی گندی گندی کتابوں کا ہے۔ حد ہو گئی! شرافت

اور اخلاق ہی ختم ہو گیا نہ چھوٹے کا لحاظ نہ بڑے کا ادب نہ بزرگوں کا احترام۔ نماز، روزہ، قرآن سب کو بھلا بیٹھے۔ سب شیطان کے چیلے ہیں، سب خبیث ہیں۔ سب مردود ہیں، سب..." اور اب گالیوں کی گردان شروع ہو چکی تھی۔"(31)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے خیال میں:

"سلیم اختر کے دوسرے دور کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کی تلخی اور سفاکی لئے ہوئے ہیں مگر سچے اور کھرے پن نے ان کہانیوں کو شاہکار بنا دیا ہے۔ اِس اعتبار سے وہ منٹو، عصمت اور دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ساتھ چلتے ہوئے ان سے الگ بھی نظر آتے ہیں۔"(32)

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کے کردار اس کے مختلف موضوعات کے لحاظ سے سامنے آتے ہیں۔ نفسیاتی / جنسی افسانوں کے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ جنس زدہ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ یہ کردار جنسی نظر آتے ہیں مگر ڈاکٹر عرش صدیقی ان کرداروں کو جنس زدہ کہنے کی بجائے یہ وضاحت کرتے ہیں:

"سلیم اختر کے (جنسی) افسانوں میں انسان کا ذکر نہیں ملتا۔ آدمی کا تصوّر نہیں ابھرتا... یہاں ہر کردار مرد ہے یا عورت۔"(33)

ڈاکٹر سلیم اختر نے ان کرداروں کو بڑی بے رحم حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے مگر اس طریقے سے کہ ان کے جنسی مسائل کی توجیہات پیش کر کے۔ اس طرح افسانہ نگار کا رویہ ان کرداروں کے ساتھ نفرت کی بجائے ہمدردی کا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مطابق:

"اگرچہ انہوں (ڈاکٹر سلیم اختر) نے منٹو کی بے رحم حقیقت نگاری سے کام لیا ہے البتہ ایک خاص بات جو ان کو منٹو سے ممیز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ جنس کو مسئلہ بنا کر پیش نہیں کرتے بلکہ اس کے نفسیاتی محرکات کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد جنس کی تہہ تک پہنچنے میں یا دوسرے لفظوں میں کردار کے لاشعور کی پاتال تک پہنچ کر اس کا Depth ایکسرے لیتے ہیں۔"(34)

سلیم اختر کی کامیاب نفسیاتی تنقید کو نقادوں نے سراہا ہے۔ یہاں تک ڈاکٹر وزیر آغا نے اس ضمن میں تعریف کی ہے۔

"پروفیسر سلیم اختر نفسیات کے طالب علم ہیں مگر انہوں نے ذہنی عوارض کے محرکات کو نفسیات کے آزاد تلازمۂ خیال یا خوابوں کے تجزیئے کی مدد سے منظر عام پر لانے کے خالص طبیبانہ رویے کی بجائے تخلیق میں مضمر بعض علامات اور لفظ و خیال کے بعض لطیف پیکروں کے مطالعہ سے خود تخلیق کار کی شخصیت کے مخفی تار و پود کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ان اقدام میں سلیم اختر صاحب نے تخلیق کار کی شخصیت کے سماجی رخ سے کہیں زیادہ اس کے باطنی رخ سے سروکار رکھا ہے۔ یوں لگتا ہے ان کے پیش نظر یہ کام ہرگز نہیں تھا کہ وہ تخلیق کے حکیمانہ تجزیے سے معلوم کریں کہ تخلیق کار کس قسم کے عوارض میں مبتلا ہیں بلکہ انہوں نے تخلیق کے تجزیئے سے تخلیق کار کے تخلیقی

باطن کو منکشف کرنے کی سعی کی ہے جو ادبی تنقید کے سلسلے میں ایک نہایت مستحسن اقدام ہے۔"(35)

حوالہ جات

1۔ رابعہ بی بی،"ڈاکٹر سلیم اختر بطور اقبال شناس" تحقیقی مقالہ ایم فل اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور،۲۰۰۷ء ص۸

2۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر،"طلوع افکار"، کراچی،"ہم سفر بگولوں کا"، ڈاکٹر طاہر تونسوی، جنوری ۱۹۵۴ء، ص ۵۳، ۵۴

3۔ دیوندر اسر،"ادیب کی نفسیات"، مشمولہ "نئی تحریریں" مرتبہ: قیوم نظر اُردو بک سٹال، بیروت لوہاری دروازہ، ۱۹۸۴، ص ۴۰

4۔ رشید امجد ڈاکٹر،"پاکستانی افسانہ۔ چند باتیں"/ (دیباچہ پاکستانی ادب (۱۹۴۷/۲۰۰۸) اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۹ ص ۱۱

5۔ دیوندر اسر،"ادیب کی نفسیات"، مشمولہ "نئی تحریریں" مرتبہ: قیوم نظر اُردو بک سٹال، بیروت لوہاری دروازہ، ۱۹۸۴،، ص ۴۲

6. طاہر تونسوی ڈاکٹر،"ہم سفر بگولوں کا" کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء، ص ۴۹

7. جلیل اشرف ڈاکٹر،"ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۶

8. سعادت سعید ڈاکٹر،"اردو ادب کی متنازعہ شخصیت کی تلاش" (کتابی سلسلہ) مشمولہ "مکالمات سلیم" مرتبہ عاصمہ اصغر، ص ۱۰۱

9۔ وسیم گوہر،"انٹرویو ڈاکٹر سلیم اختر" ماہنامہ پلک مشمولہ "مکالمات سلیم" مرتبہ عاصمہ اصغر اپریل ۱۹۹۱، ص ۹۰

10۔ سلیم اختر۔ سلیم اختر ڈاکٹر،"عورت جنس اور جذبات"، ۱۹۹۹، ص ۴۶

11۔ ایضاً ص ۹۲۔۹۳

12. سلیم اختر ڈاکٹر،"نرگس و کیکٹس"، (افسانوی کلیات)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۰۷

13۔ ایضاً ص ۶۹۹

14. سلیم اختر ڈاکٹر،"افسانہ۔ حقیقت سے علامت تک"، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۷۹

15. سلیم اختر ڈاکٹر،"ہماری جنسی اور جذباتی زندگی"، ص ۹۵۔۹۶

16. سلیم اختر ڈاکٹر،"جلے پاؤں کی بلّی" مشمولہ "نرگس اور کیکٹس"، (افسانوی کلیات)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۷۷

17. ایضاً ص ۵۷۷

18. ڈاکٹر نجیب جمال،"ڈاکٹر سلیم اختر کی افسانہ نگاری" مشمولہ "ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت و تخلیقی شخصیت" مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص ۳۵۰

19. شاہین مفتی ڈاکٹر، ''تیرہواں برج'' ماہنامہ وجداں مارچ ۲۰۰۹، ص ۳۷

20. سلیم اختر ڈاکٹر، ''نرگس اور کیکٹس''، (افسانوی کلیات)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۶۳۳

21. ایضاً ص، ۲۵۳

22. ایضاً ص، ۳۷

23. ایضاً، ص ۵۹۳

24. نیر صمدانی ڈاکٹر، ''سچ کے نیچے سچ کی تلاش''، مشمولہ، ڈاکٹر، سلیم اختر، مرتبہ ڈاکٹر، طاہر تونسوی ص ۴۱۲

25. سلیم اختر، ڈاکٹر، ''افسانہ حقیقت سے علامت تک''، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ص ۷۸

26. سلیم اختر، ڈاکٹر، ''افسانہ: پس منظر اور پیش منظر''، مشمولہ ''تنقید''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۵

27. سلیم اختر، ڈاکٹر، ''نشان جگر سوختہ'' (آپ بیتی)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۶۰

28. سلیم اختر ڈاکٹر، ''کڑوے بادام''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۹۱_۹۲

29. ایضاً، ص ۵۵

30. ایضاً، ص ۵۷

31. ایضاً، ص ۶۵_۶۶

32. سلیم اختر، ڈاکٹر، ''نرگس اور کیکٹس''، (افسانوی کلیات)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۷

33. عرش صدیقی، ڈاکٹر، سلیم اختر: ''افسانہ نگار''، مشمولہ ڈاکٹر سلیم احمد: ''شخصیت و فن''، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص ۲۸۹

34. طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ''ہم سفر بگولوں کا''، ص ۱۷۹

35. وزیر آغا ڈاکٹر، ''پیش لفظ، ادب اور لاشعور'' لاہور،، ۱۹۷۶ء، ص ۷